امیر شکیب ارسلان

از جناب سید احتشام احمد ندوی ایم۔اے۔بی۔ٹی، (علیگ)

انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر اور بیسویں صدی کے نصف اول میں عالم اسلامی ایک عظیم شخصیت سے روشناس ہوا۔ جس کی زندگی میں سیف و قلم دونوں طرز کے کمالات کی یکساں کارفرمائی تھی، یہ شخصیت امیر شکیب ارسلان کی تھی جو بیک وقت زبردست مؤرخ، ادیب اور شاعر تھے اور ساتھ ہی ساتھ ایک درد مند مصلح اور ایک سرگرم مجاہد بھی۔ ان کی زندگی ایک ایسے دور میں بسر ہوئی جو عربوں اور ترکوں کی تاریخ کا ایک بہت نازک دور تھا، امیر اس ساری کش مکش میں خود شریک رہے اور بعد میں اس کی داستان سرائی میں قلم کے جوہر دکھاتے رہے۔ امیر کی زندگی میں ایک عجیب کشش محسوس ہوتی ہے جو ان کے قلم اور ذوق عمل دونوں ہی سے عبارت ہے۔ ان کی شخصیت میں علم و عمل کی ایک ایسی بلندی نظر آتی ہے جس سے انسان متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔[1]

اس عظیم شخصیت کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ میں ایک نقشہ ان حالات اور واقعات کا پیش کروں جن میں امیر کی شخصیت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان کے دور میں جو سیاسی تبدیلیاں عالم اسلام میں رونما ہوئیں انھوں نے امیر کو ذہنی حیثیت سے بہت متاثر کیا جس کا اظہار یوں تو ان کی تمام تصانیف میں ہوتا ہے مگر "حاضر العالم الاسلامی" کے حواشی میں اُن کا یہ تاثر بہت نمایاں ہو جاتا ہے، ان کی یہ کتاب ایک عظیم کارنامہ ہے جس میں ایک جانب ایک بڑا قیمتی تاریخی مواد موجود ہے اور خود اس کے قلم سے

---

[1] مصادر الدراسۃ الادبیۃ جلد ۲،

جس نے ان واقعات کا مشاہدہ کیا ہے، اور دوسری جانب ان کے دینی خیالات اور آراء کا مرقع بھی ہے۔

امیر شکیب ۱۸۶۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۶ء میں وفات پائی۔ اس ایک صدی میں انھوں نے عربوں، ترکوں اور اہلِ یورپ کا بڑے قریب سے مطالعہ کیا۔ عثمانی خلافت سے قرب کی بنا پر وہ مغربی ممالک کی چالاکیوں سے خوب واقف ہو گئے تھے اور زندگی کا بڑا حصہ یورپ میں گذارنے کی وجہ سے انہیں مغرب کے طرزِ فکر سے پوری آگاہی حاصل تھی۔ سوئزرلینڈ میں ربعِ صدی بسر کرنے کی وجہ سے وہ مغربی سیاست کو بے نقاب دیکھ چکے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ امیر کے خیالات اور ان کی زندگی کو اس وقت تک سمجھنا بہت مشکل ہے جبتک کہ اُس ماحول اور اُن واقعات کو نہ سمجھا جائے جو اُس وقت ترکی، شام اور دوسرے عرب و اسلامی ممالک میں رونما ہوئے تھے[1]

امیر کے ذہنی ماحول کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے میں ان کے ذاتی حالات کا جائزہ لوں۔

امیر کا تعلق ابو قابوس کے خاندان سے تھا جو مشہور عربی شاعر نابغہ ذبیانی کا ممدوح تھا۔ خلیفہ ابو جعفر منصور کے زمانہ میں ان کے آباء و اجداد لبنان آئے یہاں بیروت میں ایک شخص "ارسلان" نے جو اسی خاندان سے تھا۔ وفات پائی اور اس کے بعد یہ لوگ لبنان میں ایک مقام "شویفات" میں منتقل ہو گئے۔ ارسلان کا لڑکا "مسعود" تھا جس کے چار بیٹے ہوئے اور ان میں سے تین کو خدا نے شاعرانہ صلاحیت سے نوازا یعنی حسن۔ عادل اور امیر ان سب کا کلام شائع ہو چکا ہے۔ امیر شکیب کے 'ارسلان' لکھنے کی وجہ یہی ہے۔

امیر شکیب ۱۸۶۹ء میں لبنان میں پیدا ہوئے، پہلے گھر پر تعلیم پائی پھر مدرسۃ الحکمۃ میں داخل ہوئے وہاں جاکر ان کے علمی جوہر نمایاں ہونے لگے اور نظم و نثر دونوں میں ان کی استعداد کا علم لوگوں کو ہوا۔ مدرسۃ الحکمۃ میں ایک بار امام محمد عبدہ آئے۔ اس نوجوان طالبِ علم نے ان سے ملاقات کی، انھوں نے فرمایا کہ میں تمہارے نام سے تو واقف ہوں، امید ہے کہ تم آگے چل کر بڑے شاعر بنو گے۔ اس کے بعد امیر "المدرسۃ السلطانیہ" میں داخل ہوئے اور ترکی پڑھی۔ پھر ۱۸۹۱ء میں مصر جاکر چند ماہ محمد عبدہ کے پاس گذارے وہاں سے آستانہ جاکر جمال الدین افغانی سے تعلقات پیدا کئے۔ وہاں سے ۱۸۹۲ء میں پیرس گئے۔ اس وقت ان کے ذہن و دماغ پر جمال الدین افغانی اور محمد عبدہ کے علمی و اسلامی خیالات چھائے

[1] محاضرات عن الامیر شکیب ارسلان۔

ہوئے تھے۔ کچھ دنوں بعد جب امیر بیروت واپس آئے تو ان سے اور سید رشید رضا سے بہت گہرے مراسم پیدا ہو گئے۔ اسی درمیان انھیں "شوف" کی قضاۃ کا عہدہ مل گیا۔ ۱۹۰۸ء میں۔ بعد میں مقامی عثمانی حکام سے اختلافات ہو گئے جس کی بنا پر امیر نے اس عہدے سے استعفیٰ دیدیا۔ اور مجلس المبعوثین "آستانہ" کے رکن ہو کر پہلی جنگ عظیم تک کا کام کرتے رہے۔ [1]

ذہنی صلاحیت و ثقافت کے اعتبار سے وہ غیر معمولی اہمیت کے حامل تھے، ترکی بیروت ہی میں سیکھی تھی پھر آستانہ میں ترکوں کے ساتھ رہ کر اس کو گویا مادری زبان سی بنالی تھی، فرانسیسی بھی بیروت ہی میں سیکھی۔ اور مختلف فرانسیسی پرچوں میں مضامین لکھتے رہے اور ۲۵ سال تک سوئزرلینڈ کے زمانۂ قیام میں فرانسیسی ہی روزمرہ استعمال کرتے رہے۔ جرمن زبان برلن میں سیکھی اور وہاں شوقی کے بعض قصائد کا ترجمہ بھی جرمن زبان میں کیا تھا۔ فرانسیسی زبان میں ایک رسالہ کالاجس کا نام (La Nation Arabe) تھا۔ جو یادداشت فرانسیسی زبان میں امیر نے یادگار چھوڑی ہے وہ بیس ہزار صفحات پر پھیلی ہوئی ہے۔ تقریباً ۳۰ ہزار خطوط یادگار چھوڑے ہیں۔ وہ ۳۰۰ سو مقالے، دو ہزار خطوط اور کچھ ہزار صفحے اپنی تصانیف کے ہر سال لکھتے تھے اور اپنے دور کے سب سے بڑے مقالہ نگار تھے۔ مختلف زبانوں کی واقفیت کی وجہ سے ان تصانیف میں روشن خیالی نمایاں ہے۔

اس وسیع ذہنی تہذیب و ثقافت نے ان کے خیال کے افق کو بہت وسیع کر دیا تھا۔ ان جدید زبانوں کے بلند لٹریچر نے ان کو بہت متاثر کیا تھا اور اسلامی علوم و فنون کے ساتھ ساتھ انہیں روشن خیال بنا دیا تھا۔ [2]

اب ذرا اس دور کے سیاسی حالات پر ایک نظر ڈالئے اور ان میں امیر کی جد و جہد کا اندازہ کیجئے، تاکہ ان کی شخصیت کا ایک نقشہ نگاہوں میں آجائے۔

سولہویں صدی میں شام پر دولت عثمانیہ کا قبضہ ہو گیا۔ چونکہ اسلامی خلافت میں عیسائیوں سے جزیہ لیا جاتا تھا۔ اور ملازمتیں عملاً مسلمانوں ہی کے ہاتھوں میں تھیں، یہی وجہ تھی کہ مغربی حکومتیں بار بار عیسائیوں کی حفاظت کا دعویٰ کرتی تھیں اور اس بہانے دولت عثمانیہ کے اندرونی معاملات میں دخل انداز ہوتی تھیں۔

---

[1] مجلہ کتاب فروری ۱۹۴۷ء رفائل بطی ص ۵۷۲ اور محاضرات ص ۱۸۶ سے ۱۸۷ تک۔

عربی سلطنت جو دولتِ عثمانیہ کے قبضہ میں تھی اس کے نظریاتی طور پر دو حصہ ہو گئے تھے۔ ایک طبقہ دولتِ عثمانیہ کا حامی تھا اور اس کو اسلامی خلافت تصور کرتا تھا۔ دوسرا گروہ عربوں اور عیسائیوں سے مرکب تھا جو عثمانی حکومت کو ایک استبدادی حکومت خیال کرتا تھا اور اس سے آزادی حاصل کرنے کی جد وجہد کر رہا تھا۔ وہ اس کے لئے بھی تیار تھا کہ اگر موقع ملے تو دولتِ عثمانیہ کے دشمنوں اور مغربی حکومتوں سے مدد لے۔

محمد علی نے مصر و شام پر قبضہ کر لینا چاہا مگر فرانس و انگلستان اس بات سے ڈرنے لگے کہ مبادا کہیں یہ ایک مضبوط حکومت نہ قائم کر دے لہٰذا درمیان میں پڑ کر صرف مصر کو محمد علی کے پاس رہنے دیا۔ دروز اور عیسائیوں کے اختلافات نے فرانسیسیوں کو اپنا اثر بڑھانے کا موقع دیا۔ علاوہ ازیں دولِ عظمیٰ سلطنتِ عثمانیہ کی تقسیم کا نقشہ تیار کر چکی تھیں چنانچہ طرابلس پر اٹلی، مصر پر انگریز اور تونس پر فرانس قابض ہو گئے۔ یہ لوگ انسانیت اور آزادی کے نام پر عربوں کو غلام بنا رہے تھے اور عرب قومیت کے جذبات عثمانیوں کے خلاف برانگیختہ کر کے خود فائدہ اٹھا رہے تھے۔ ظاہر ہے کہ اس صورتِ حال میں عثمانیوں کو عربوں کی جانب سے خطرہ بڑھ گیا اور حکومت نے بیشمار جاسوس عرب ملکوں اور خود ترکی میں پھیلا دیئے۔ حکومت کا یہ حال ہو گیا کہ ملازمین کی تنخواہیں تک مہینوں ادا نہ ہو پاتی تھیں[1]

علاوہ ازیں عربی زبان ترکی میں پڑھائی جاتی تھی خود عربوں کے اپنے مدارس مفقود تھے، عربی عموماً عیسائیوں کی تعلیم گاہوں میں اچھی پڑھائی جاتی تھی۔ یہ عثمانی حکومت کی ایک ایسی غلطی تھی کہ جس سے مغربی حکومتوں نے بڑا فائدہ اٹھایا، امریکہ نے بیروت میں ایک عظیم عربی درسگاہ کھولی، اس کی اتباع میں فرانسیسیوں انگریزوں، روسیوں اور جرمنوں نے بھی اپنے طرز کے مدارس کھولے۔ امیر شکیب فرماتے ہیں کہ جدید دور میں علم کی روشنی بیروت ہی سے عربی دنیا میں پھیلی ہے۔ شام میں دمشق بھی علمی حیثیت سے پیچھے نہیں رہا۔ یہاں اکثر علمی و تنقیدی محفلیں منعقد ہوتی تھیں جن میں امیر حصہ لیا کرتے تھے۔ جو لوگ بیروت کی درسگاہوں سے فارغ ہوئے ان کی شہرت مصر جا کر ہوئی۔ کیونکہ مصر اپنی قدیم اور عظیم علمی شہرت کی وجہ سے زیادہ اہمیت رکھتا تھا اور وہاں صحافت کا بازار بھی زیادہ گرم تھا۔ عموماً اہلِ علم قاہرہ استفادہ کرنے جایا کرتے تھے۔

[1] دولتِ عثمانیہ جلد دوم۔ باب نوجوان ترک۔

امیر شکیب، کرد علی اور عبد القادر المغربی وغیرہ قاہرہ گئے اور وہاں سے ان کی شہرت بڑھی۔ یہ تھے سیاسی اور تعلیمی حالات جن میں امیر شکیب پروان چڑھے۔

انیسویں صدی کا ربع آخر اور بیسویں صدی کا ربع اول عثمانی حکومت اور دولِ عظمیٰ کی باہمی کشمکش میں گزرا۔ امیر شکیب دولتِ عثمانیہ کو خلافت سمجھتے تھے اور اس کے حامیوں میں تھے۔ وہ اپنے دوسرے ساتھیوں شوقی، اسماعیل صبری اور حافظ ابراہیم کی طرح اسلامی خیالات پر مضبوطی سے جمے رہے اور حکومتِ عثمانیہ کی تائید کرتے رہے۔ اگرچہ لوگ ان کے اس رویہ پر تنقید کرتے تھے لیکن انھیں اپنی رائے پر یقین تھا۔ جب پہلی جنگ ختم ہوئی تو شام و لبنان فرانس کو ملے، عراق، مصر اور فلسطین انگریزوں کو۔ اس جارحانہ قبضہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب اسی طرح وہی عربی قومیت مغربی حکومتوں کے خلاف ابھر آئی جس کو برانگیختہ کرکے ان ممالک نے عربوں کو ترکوں کے خلاف کر دیا تھا۔ دوسری جنگِ عظیم نے عربوں کے مطالبۂ آزادی میں جان پیدا کر دی اور امیر شکیب نے اپنا وطن لبنان اور اس کے علاوہ شام کو اپنی آنکھوں سے آزاد ہوتے دیکھ لیا۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں جو سیاسی جد و جہد کی گئی اس میں امیر کی مساعی کو واضح طور پر بیان کیا جائے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب طرابلس پر اٹلی نے حملہ کیا تو مجاہدین کی صف میں امیر شکیب بھی تھے، اور سنوسی بزرگوں کے ساتھ مل کر عزم و ہمت کے جوہر دکھلا رہے تھے۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں وہ ہلالِ احمر عثمانی سے ملازم ہو گئے۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد امیر کی پوزیشن بڑی نازک ہو گئی، عربوں اور ترکوں میں آزادی کی کشمکش تھی، سب سمجھ رہے تھے کہ جس طرح ان مغربی حکومتوں نے مل کر مشرقی یورپ کو ترکوں سے آزاد کرایا ہے، اسی طرح یہ ہمیں بھی آزادی دلائیں گی، مگر محض عربوں کی خام خیالی تھی جس کو امیر خوب سمجھ رہے تھے، وہ جانتے تھے کہ عرب عثمانیوں کے بجائے مغربی ممالک کے غلام بنیں گے۔ اسی وجہ سے امیر نے عربوں کو ترکوں کی مخالفت سے باز رکھنے کی کوشش کی اور دونوں میں اسلامی اخوت بیدار کرنے کی سعی لاحاصل کرتے رہے۔ لیکن اس صحیح طرزِ فکر پر عرب کی جذباتی قوم ان کے خلاف ہو گئی اور ان پر ہر طرف سے لعن طعن ہونے لگی، اور ان کو عثمانیوں کا خوشامدی سمجھا جانے لگا۔ امیر اپنے ایک قصیدہ میں اپنے موقف کی تائید کرتے ہیں اور کہتے ہیں

کہ عربوں کو محض میری جانب سے غلط فہمی ہے میں ان کو جو راہ دکھانا چاہتا ہوں وہ اس وقت ان کے لئے سب سے بہتر ہے وہ فرماتے ہیں۔

سیعلم قومی أننی لا أغشھم ومھما استطال اللیل فا لصبح واصلہ

ترجمہ:۔ عنقریب میری قوم جان لے گی کہ میں اس کو دھوکہ نہیں دے رہا ہوں اور رات خواہ جتنی ہی طویل ہو جائے صبح بہرحال ہونے والی ہے۔[1]

امیر کو سنوسی تحریک سے بڑی عقیدت تھی، وہ جو دینی فکر اور مسلمانوں کے مستقبل کا نقشہ ذہن میں رکھتے تھے، سنوسی تحریک کو اس مقصد سے وہ ہم آہنگ پاتے تھے۔ وہ خود بھی کئی بار اس تحریک میں شریک ہوئے جو دراصل وطن تحریک نہ تھی بلکہ ایک اسلامی تحریک تھی اور انھوں نے اس تحریک کے ساتھ جہاد میں حصہ لیا۔ سید احمد سنوسی کے حالات بھی انھوں نے اپنی کتاب "حاضر العالم الاسلامی" میں بیان کئے ہیں، اور اس تحریک کے بارے میں بہت مفید معلومات فراہم کی ہیں۔ اٹلی نے جب ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر حملہ کیا، تو حکومتِ عثمانیہ کی جانب سے انور پاشا مدافعت کیلئے طرابلس گئے وہاں سنوسی تحریک کے بزرگوں سے اُن کے بڑے مراسم ہو گئے۔ امیر بھی اُس وقت وہاں مصروفِ جہاد تھے۔ میدانِ جہاد میں امیر اور انور ایک ہی خیمہ میں رہتے تھے اور اس طرح دونوں میں بڑے خوشگوار تعلقات ہو گئے۔ انور پاشا نے امیر ہی کے مشورہ سے مدافعت کا نقشہ تیار کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ دونوں کے اسلامی خیالات اور خلافت کے قیام کے منصوبے بالکل یکساں تھے اور سنوسی تحریک کے مقاصد بھی یہی تھے۔ اس لئے ان سب میں ایک گہرا رشتہ ہو جانا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔ امیر نے حاضر العالم الاسلامی میں انور کے حالات لکھ کر ان کے تعلقات کا حق ادا کر دیا۔[2]

جمال پاشا جب عربوں کی شورش ختم کرنے لبنان و سوریا آئے تو انور پاشا نے انہیں یہ مشورہ دیا کہ وہ امیر پہ اعتبار کریں اور ان کے مشوروں سے کام انجام دیں، اگرچہ جمال نے کبھی کبھی امیر کے اخلاص پر شبہ کیا مگر امیر برابر اُن کی مدد میں لگے رہے، پہلی جنگِ عظیم کے بعد امیر کی ساری امیدیں انور سے وابستہ ہو گئیں تھیں۔

---

[1] مجلہ "الکتاب" فروری ۱۹۴۷ء استاذ رفائل بطی ص ۵۶۹

[2] ملاحظہ ہوں حاضر العالم الاسلامی کے حواشی خصوصاً "انور پاشا ورفقارہ"۔

لیکن جب ۱۹۲۰ء میں انور پاشا روسی ترکستان میں سُرخ فوجوں سے لڑتے ہوئے شہید ہوئے تو وہ مقام "مرسیں" ترکی آگئے اور یہاں سے برلن چلے گئے اور آرام سے زندگی گذارنے لگے۔ اسی موقع پر انہیں مشہور شاعر گوئٹے کی قبر پر جانے کا اتفاق ہوا۔ امیر نے مَن شاعر الشرق الی شاعر الغرب" مشرق کے شاعر کی جانب سے مغرب کے شاعر کی طرف ایک نظم کہی جن میں چند شعر تھے[1]

عربوں نے جب فلسطین اور شام کی آزادی کے لئے قاہرہ میں جلسہ کیا اور "جنیوا" ایک وفد بھیجنا طے کیا تو ان کی نظر امیر شکیب پر پڑی اور انہیں برلن سے بلا کر وفد میں شامل کیا۔ امیر برابر شام کی آزادی کے لئے جد وجہد کرتے رہے، وہ "جنیوا" میں ٹھہر گئے اور ۲۵ سال تک وہیں مقیم رہے۔ مذکورہ وفد کے زمانہ میں امیر نے اٹلی جاکر مسولینی سے ملاقات کی اور اس کے اثرات سے فرانسیسیوں کو دبانے کی کوشش کی، علاوہ ازیں فرانسیسی اخبارات میں بہت سے مضامین لکھے جس کی وجہ سے عربوں کو امیر کی ذات میں بڑا اعتماد پیدا ہوگیا۔

مہاجرین عرب جو شمالی امریکہ میں مقیم تھے انھوں نے امیر کو بڑی عقیدت سے بلایا، امیر نے دعوت نامہ قبول کرلیا اور ۱۹۴۷ء میں وہ شمالی امریکہ تشریف لے گئے۔ اور وہاں اس مشہور امریکی[2] مصنف اور مستشرق سے ملاقات کی جس نے "حاضر العالم الاسلامی" مشہور کتاب لکھی تھی جس کا عربی میں ترجمہ کیا گیا تھا اور اس ترجمہ پر امیر نے حواشی لگائے تھے جس کی وجہ سے کتاب تگنی ہوگئی۔ امریکہ کی یاد میں امیر نے ایک سفرنامہ بھی تیار کیا جو ان کتابوں میں سے ہے جن کو امیر نے "مکتب المؤتمر الاسلامی" کے حوالہ کردیا تھا تاکہ وہ ان کے مرنے کے بعد شائع ہو۔[3]

جب ۱۹۳۴ء میں ابن سعود اور امام یحییٰ شاہ یمن کے درمیان جنگ ہوئی اور صورت حال بڑی خطرناک ہوگئی تو مؤتمر العالم الاسلامی بیت المقدس نے امیر کی صدارت میں ایک وفد بھیجا جس نے دونوں میں صلح کرائی۔[4]

---

[1] مجلۃ الکتاب فروری ۱۹۴۷ء ص ۵۶۸ تا ۵۷۲ [2] اس مستشرق کا نام لوتھروپ ستوارد تھا۔
[3] مجلۃ الکتاب ص ۵۷۰ [4] حوالہ بالا۔

۱۹۳۰ء میں وہ فرانس ہوتے ہوئے اندلس گئے وہاں اُن علاقوں کو بڑے شوق وتمنا سے دیکھا جہاں سے عربوں نے فکر و نظر کی دنیا میں روحانی نقوش چھوڑے تھے۔ جو متاثر کرنے والی چیزیں ان کو نظر آئیں نوٹ کرلیں۔

۱۹۳۸ء میں امیر کو شام واپس جانے کی اجازت مل گئی۔ وہ جنیوا سے شام آئے سارے ملک کا دورہ کیا۔ ان کے عظیم کارناموں کی وجہ سے عربی زبان کی سب سے اہم اور مشہور مجلس "المجمع العلمی العربی" نے اُن کو اپنا صدر منتخب کرلیا۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا جو انہیں دیا گیا۔ لیکن جب امیر کو فرانسیسیوں کی مکاری اور ان کے خلاف سازش کا علم ہوا تو وہ مایوس ہوکر پھر سوئزرلینڈ چلے گئے۔ ۱۹۳۹ء میں انہیں مصر دیکھنے کی اجازت مل گئی تو وہ تقریباً ۵۰ برس بعد مصر کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ اور اسکندریہ و قاہرہ وغیرہ میں چھ ماہ گذار کر پھر "جنیوا" چلے گئے۔

ان تمام کوششوں اور کاموں کے ساتھ ساتھ امیر نے اپنے علمی کام جاری رکھے اور ہزاروں صفحات لکھ ڈالے، وہ اپنا ایک منٹ بھی ضائع نہ کرتے تھے[1] انھوں نے اتنے مقالات لکھے ہیں کہ انھیں اپنے دور کا سب سے بڑا مقالہ نگار سمجھا جانے لگا[2] چونکہ امیر کے تعلقات اپنے دور کے تمام اہم لوگوں سے تھے اور ان سے وہ قریبی تعلق رکھتے تھے[3] اس لئے امیر کو خط بہت لکھنے پڑتے تھے، ان کا قاعدہ تھا کہ وہ خط کا جواب ضرور دیتے تھے۔ ہر سال تقریباً سیکڑوں خطوط لکھتے تھے۔ تیس ہزار خطوط انھوں نے یادگار چھوڑے ہیں[4]

امیر کی مالی زندگی کچھ خوشگوار نہ تھی وہ بڑی عسرت سے زندگی گذارتے تھے[5] اس تمام عرصہ میں امیر نے اپنی جائداد کا بڑا حصہ فروخت کرڈالا۔ یہی جائداد دراصل امیر کا ذریعۂ معاش تھی جو انہیں لبنان اور سوریا میں ورثہ میں ملی تھی۔ امیر اگرچہ بظاہر بڑی خوش حالی سے رہتے تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ ملا

---

[1] محاضرات ص ۲۲ [2] مصادر الدراسۃ الادبیۃ ص ۹۷ [3] مجلۃ "الأبحاث" سنہ ۷ جزء ۱ سنہ ۱۹۵۴ء و مقالہ نگار جبرئیل جبور ص ۳۴۔ [4] مصادر الدراسۃ العربیہ جلد دوم ص ۹۷
[5] مجلۃ الکتاب ص ۵۷۲۔

اُن کے پاس کچھ نہ تھا اور جائیداد بیچ بیچ کر کام چلاتے تھے، اکثر اتنے پیسے تک ان کے پاس نہ ہوتے تھے کہ ہوٹل والے کو ادا کر سکیں۔

تعجب ہوتا ہے کہ اس صورتِ حال میں فرانس نے کیوں کر ان پر الزامات لگائے کہ امیر کو غیر ممالک سے رقمیں ملتی ہیں۔ اُس کا اشارہ جرمنی کی طرف تھا اور اس نے یہ بھی الزام لگایا کہ ہٹلر نے انہیں "ابنِ برلن" کا خطاب دیا تھا۔ اس سے فرانس کا اس کے سوا اور کوئی مقصد نہ تھا کہ اس طرح امیر کو عرب ممالک کی نگاہوں میں گرا دیا جائے۔

جب ۱۹۴۵ء میں دوسری جنگِ عظیم ختم ہوئی تو فرانس کے اثرات لبنان و شام سے جاتے رہے۔ امیر اپنے وطن واپس آنا چاہتے تھے۔ مگر قرض کے بار کی وجہ سے فوراً واپس نہ آسکے۔ ۱۹۴۶ء میں وہ اسکندریہ کے راستہ سے "مرفاء" پہونچے، بیروت میں اُن کا زبردست استقبال کیا گیا۔ اس لئے کہ انھوں نے لبنان کی آزادی کے لئے بہت کچھ کیا تھا۔ جب وہ وطن پہونچے تو زائرین کا سمندر امنڈ آیا۔ ڈاکٹروں نے ملنے جلنے سے صحت کی خرابی کی وجہ سے منع کیا مگر امیر برابر ملتے رہے اور گفتگو کرتے رہے۔ انھوں نے یہاں آکر اپنے اہل وعیال کے ساتھ ۳۶ دن گذارے تھے کہ ان پر فالج کا حملہ ہوا۔ چار دن گذار کر یہ آفتاب خاک میں پوشیدہ ہوگیا۔ ان کے جنازہ کے ساتھ چلنے والوں میں بے شمار انسانوں کے علاوہ خود صدرِ جمہوریت شیخ بشارہ خوری بھی تھے۔ اس طرح ان کی تین بڑی آرزوئیں پوری ہوئیں۔ وطن میں انتقال کیا، ماں کو دیکھا اور ملک آزاد پایا۔

ان کی نعش ان کے اصل وطن "اشویفات" میں دفن کی گئی اور امیر نے اُس خاک میں سونا پسند کیا جس میں انھوں نے بچپن گزارا تھا اور جہاں انھیں جوانی کی دولت عطا ہوئی تھی[1]

یہ تو تھی ان کی ظاہری زندگی جو ختم ہوگئی، اب آیئے ان کی معنوی زندگی پر ایک نظر ڈالیں جو کہ ختم ہونیوالی نہیں ہے یعنی ان کے خیالات و تصانیف۔

ان کے دینی خیالات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ مشرق و مغرب کے علوم سے واقفیت کی وجہ سے

[1] "محاضرات" ملاحظہ ہو ص ۱۴ سے ۳۶ تک۔

ان کی زندگی میں بڑا اعتدال و توازن نظر آتا ہے۔ وہ اس صف کے ممتاز لوگوں میں ہیں جس نے سب سے پہلے اسلامی علوم کی واقفیت کے ساتھ ساتھ مغربی علوم و زبان سے بھی گہری واقفیت حاصل کی۔ تعجب ہوتا ہے کہ اس مجاہدانہ زندگی اور حرب و ضرب میں ان کو اتنا موقع کیسے مل جاتا تھا کہ وہ اتنی زیادہ تصانیف کر سکے۔ مسلمانوں کا اتحاد اور ان کی ترقی امیر کے خیالات کا محور تھی اس سلسلہ میں انھوں نے تین بڑی اہم کتابیں تصنیف کی ہیں یعنی

(۱) حاضر العالم الاسلامی: جس کا اصل مصنف ستوڈارڈ امریکی ہے۔ اس کتاب کا ترجمہ عربی میں عجاج نویہض نے کیا ہے۔ امیر نے اس کتاب پر حاشیے تحریر فرمائے ہیں لیکن اصل کتاب بالکل دب کر رہ گئی ہے اور پوری کتاب حاشیوں سے پُر ہے۔ یہ حواشی امیر کی قلمی جدوجہد کا شاہکار ہیں۔

(۲) لماذا تأخر المسلمون ولماذا تقدّم غیرھم: امیر سے لوگوں نے درخواست کی تھی کہ آپ مسلمانوں کی پستی کے اسباب پر روشنی ڈالئے یہ کتاب اس سوال کا جواب ہے جس میں مسلمانوں کے اخلاقی امراض کی نشاندہی کی گئی ہے۔

(۳) الحلل السندسیۃ: اس کتاب میں مسلمانوں کے حالات کا ذکر کیا ہے ماضی کی یاد دلائی ہے اور مسلمانوں کو چونکانے و غیرت دلانے کی کوشش کی ہے۔

حاضر العالم الاسلامی میں امیر نے ایک غیر معمولی تاریخی ذخیرہ کے علاوہ یہ بھی کوشش کی ہے کہ اہل یورپ کے خیالات جو اسلام کے متعلق ہیں ان کا تجزیہ کریں، وہ اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ یہ لوگ کبھی بھی مسلمانوں کے خیرخواہ نہیں ہو سکتے، اس موضوع پر انھوں نے بہت طویل معلوماتی حاشیے تحریر کئے ہیں، علاوہ ازیں اپنے دور کے عرب و ترک ممتاز مسلمانوں کے حالات قلمبند کئے ہیں، اس لحاظ سے یہ کتاب بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ امیر نے ہر ہر ملک کے مسلمانوں پر اس میں الگ الگ حاشیے لکھے ہیں۔

مسلمان پیچھے رہ گئے اور کیوں دوسرے آگے نکل گئے) اس کتاب میں امیر نے مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی زندگی کا تجزیہ کیا ہے اور ان کے انحطاط کے اسباب بتانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی نگاہ میں مسلمانوں کے انحطاط کے بہت سے اسباب تھے۔ اجمالاً ان کا خلاصہ یہ ہو سکتا ہے۔

(۱) ابتدا میں اگر حضرت علیؓ و حضرت عثمانؓ وغیرہ کے زمانہ میں اختلافات نہ ہوئے ہوتے تو مسلمان پوری دنیا کو فتح کر لیتے۔

(۲) غیرت اور عمل کے فقدان نے مسلمانوں کو پستی میں مبتلا کر دیا ہے حالانکہ قرونِ اولیٰ میں ان کے اندر عمل کا بے پناہ خزانہ موجود تھا اور اس کے برعکس اب ان پر بے عملی طاری ہے۔

(۳) ایثار و قربانی کی قوت مسلمانوں میں باقی نہیں رہی ذرا سے نقصان سے وہ ڈر جاتے ہیں۔

(۴) جاسوسی و خیانت ان کا عام مرض ہے، ہر شخص ذاتی فائدہ کو قومی فائدہ پر ترجیح دیتا ہے۔

(۵) انھیں اپنی ذات پر یقین نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ترقی تو یہی مغربی ممالک کر سکتے ہیں۔

(۶) امیر علوم جدیدہ پر بہت زور دیتے ہیں اور ترقی کے لئے اس کو ضروری قرار دیتے ہیں، یہ بھی مسلمانوں کی پستی کا ایک راز ہے۔[۱]

امیر نے ۵ کتابیں ایڈیٹ کی ہیں اور ان کے علاوہ مندرجہ ذیل کتابیں اور تصنیف کی ہیں (مذکورہ تینوں کتابیں اس شمار سے الگ ہیں)

۱- شوقی واصدقاءہ اربعین سنۃ - ۲- السید رشید رضا ۳- غزوات العرب فی فرنسا وسویرا وایطالیا وجزائر البحر المتوسط، اس کا ترجمہ اردو میں نجم الدین شکیب صاحب نے "مشرقی یورپ پر عربوں کے حملے" کے عنوان سے کیا ہے جس کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے شائع کیا ہے۔ ۴- خاتمۃ تاریخ العرب فی الاندلس[۲]

امیر فرماتے ہیں کہ میں ایک منٹ بھی ضائع نہیں کرتا۔ سال کے دوران میں دو ہزار خطوط لکھتا ہوں اور سیکڑوں مقالے۔ انتقال سے کچھ پہلے تقریباً ۲۰ جلدیں جن میں انھوں نے اپنے دور کے حالات قلمبند کئے تھے وزارت خارجہ شام کو سپرد کیں۔[۳]

اگرچہ امیر کی علمی و سیاسی عظمت نے ان کی شاعرانہ صلاحیت کو کچھ دبا سا دیا ہے اس لئے وہ باوجود شاعر

---

[۱] محاضرات ص ۱۵۰ تا ۱۵۴ [۲] مصادر الدراسۃ الادبیۃ جلد دوم مؤلفہ یوسف سعد داغر ص ۹۷، ۹۸

[۳] محاضرات ص ۲۲، مصادر الدراسۃ الادبیۃ الجزء الثانی مؤلفہ یوسف سعد داغر، ص ۹۷ یہ وہی یادداشتیں ہیں جو فرانسیسی زبان میں ہے اور جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

ہونے کے اس حیثیت سے معروف نہیں ہیں حالانکہ ان کا ایک پورا دیوان بھی موجود ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ جو اسلوب انھوں نے نثر میں اختیار کیا وہ نظم میں نہیں کر سکے۔

میں امیر کی شاعری پر زیادہ لکھنا نہیں چاہتا کیونکہ ان کی زندگی کے دوسرے پہلوؤں کے مقابلہ میں اس کی کوئی اہمیت نہیں پھر بھی چند باتیں اس سلسلہ میں ان کی شاعری کے متعلق ایک عام معلومات فراہم کر سکیں گی۔

جیسا کہ ذکر ہو چکا ہے امیر زمانۂ طالب علمی ہی سے مشقِ سخن فرماتے تھے اور ان کے اشعار مختلف پرچوں میں شائع ہوتے تھے۔ انھوں نے کبھی اپنے آپ کو شاعری کے لئے وقف نہیں کیا بلکہ وقتاً فوقتاً کبھی کسی تقریب یا کسی موقع پر شعر کہدیا کرتے تھے۔ مختلف واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے اندر شاعری کا بہت اچھا سلیقہ تھا اور فطرت سے شاعرانہ طبیعت انہیں عطا ہوئی تھی۔ چنانچہ ۱۹ ہی سال کی عمر میں ان کا ایک دیوان "الباکورہ" کے نام سے شائع ہو گیا، بیروت ۱۸۸۷ء میں، بعد میں ۱۹۳۵ء میں مصر سے دیوان "شکیب ارسلان" کے نام سے شائع ہوا۔ جب شیخ جمال الدین سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے اس جوہر کو تاڑ لیا اور فرمایا "سُقیا الأرض أنبتتک" "سرسبز و شاداب ہو وہ سرزمین جس نے تم کو جنم دیا ہے"

جیسا کہ گذر چکا ہے کہ محمد عبدہ سے جب مدرسہ میں ایک بار ملاقات ہوئی تو انھوں نے پیشین گوئی کی تھی کہ تم آگے چل کر ایک بڑے شاعر ہو گے، اُن کے ذوقِ شعری کو ایک جانب ان کے گھر کی فضا سے مدد ملی اور دوسری جانب ان کو عبداللہ البستانی جیسا استاد مل گیا جو بہت عمدہ ذوقِ شعری رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اتنی کم عمری میں وہ بڑے پُرگو شاعر ہو گئے۔

امیر خود فرماتے ہیں کہ میری عمر جب چودہ سال کی تھی جبھی سے ادبی رسائل میں میرے اشعار چھپنے لگے اور دیکھنے والے مجھے شبہ کی نگاہ سے دیکھتے تھے لیکن رفتہ رفتہ انہیں یقین ہو گیا کہ میں شاعر ہوں۔[2]

امیر کا پہلا دیوان جب شائع ہوا تو انھوں نے محمد عبدہ کو اس کا ایک نسخہ بھیجا اور ساتھ میں

---

[1] مجلۃ الأبحاث سنہ ۱ جزو ۱ ۱۹۵۴ء ص ۳۴ اور مجلۃ الکتاب ص ۵۷۲

[2] محاضرت عن امیر شکیب ارسلان سامی الدہان ص ۴۳

ایک قصیدہ بھی روانہ کیا جو بڑے شاعرانہ اور لطیف رنگ میں ہے جس میں ایک طرف خود شعر کی تعریف ہے اور دوسری جانب اس بات کا بھی ذکر ہے کہ ان کی عمر کم ہے۔

لاغرو ان اهدی الیك رقائقی وأنا رقیق فضائل ومآثر

کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ میں آپ کی جانب اپنے غلاموں (شعروں) کو ہدیہ کروں (جبکہ) میں فضائل کا غلام ہوں۔

لیس القریض سوی تأثر خاطر مما به للمرء قرة ناظر

شعر ایک تأثر قلب کے سوا کچھ نہیں ہے جس سے انسان کی آنکھوں کو ٹھنڈک محسوس ہوتی ہے۔

قد باکرتنی قبل صادق فجره قد کنت من أعوامه فی العاشر

اشعار عمر کی صبح صادق سے پہلے ہی مجھ تک پہونچ گئے حالانکہ میں عمر کے دسویں ہی سال میں تھا۔

امیر کو شاعری کے ذریعہ سے اپنی ابتدائی زندگی میں اپنے دور کے مشہور اور اہم لوگوں سے قربت کا موقع ملا اور ان کو اس کی وجہ سے شوقی، اسمٰعیل، صبری، ابراہیم الیازجی اور عبداللہ فکری جیسے اہم شعراء کے ساتھ برابری کے تعلقات رکھنے کا بہت ہی کم عمری میں موقع مل گیا امیر نے اپنے دور کے تمام شعراء کے مقابلہ میں سامی بارودی سے بہت زیادہ اثر قبول کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ امیر قدماء کے طرز شاعری کے دلدادہ تھے اور خصوصاً عصر عباسی کی شاعری کو بہت پسند کرتے تھے اور اس دور کے رنگ میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ بارودی چونکہ قدماء ہی کا تتبع کرتے تھے اس لئے امیر نے اپنی شاعری میں انہی کا تتبع کیا۔ امیر نے بارودی کی مدح میں ایک قصیدہ کہا اور ان کی تعریف کی تو انھوں نے شکیب کی تعریف کا جواب ایک نظم میں بڑی اچھی طرح دیا وہ کہتے ہیں۔

لك السبق دونی فی الفضیلة فاشتمل بحلتها فالفضل للمتقدم

فضیلت میں تم کو سبقت حاصل ہوئی (نہ کہ مجھ کو) لہٰذا فضیلت کا لباس پہن لو اس لئے کہ وہ سبقت کرنے والے ہی کو حاصل ہوتی ہے۔

اس کے جواب میں امیر نے ایک دوسری نظم کہی، چند شعر ملاحظہ ہوں۔

رأى كرماً في تذكره قولـه   فدلّ على أعلى خلال وأكرم

بارودی نے اپنے تذکرہ میں (میرے یہاں) کرم و اچھائی دیکھی تو یہ بات ان کے اعلیٰ اخلاق پر دلالت کرتی ہے۔

وأنت الذي يا ابن الكرام أعدتها   لأفصح من عهد النُّواس ومسلم

اور آپ نے عہد ابو نواس اور مسلم سے بھی بڑھ کر فصیح شعر کہے

امیر اور شوقی میں بڑے اچھے دوستانہ تعلقات تھے شوقی نے اپنے دیوان کا نام "الشوقیات" انہیں کے مشورے پر رکھا تھا۔

شوقی خود اپنا تعلق امیر سے ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ؎

حرصت عليها آنة ثم آنة   كما ضنّ بالماس الكريم خبير

شکیب کے ساتھ رہنے پر بار بار میں حریص ہوا جیسے کوئی جوہری اچھے الماس کے بارے میں بخیل ہوا (ھا کی ضمیر پہلے شعر میں برھتہ کی طرف ہے)

فلمّا تساقينا الوفاء وتمّ لي   وداد على كل وداد أمير

جب ہم نے آپس میں وفا کی شراب پی اور ساری محبتوں سے بڑھ کر محبت مکمل ہو گئی۔

تفرق جسمي في البلاد وجسمه   ولم يتفرق خاطر وضمير

تو ملک میں میرے اور اس کے جسم جدا جدا ہو گئے مگر دل و ضمیر ساتھ رہے

امیر نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ عبد اللہ فکری کو بھیجا اور ساتھ میں ایک نظم جس میں ان سے یہ شکایت کی کہ ان کا دیوان غزل سے خالی ہے۔ دو شعر ملاحظہ ہوں :۔

جعلت القول في سيف ورمح   وعفت النظم في قد وخصر

تم نے تلوار و نیزے کے بارے میں باتیں کہیں اور قد و کمر کے بارے میں نظم کہنے سے دامن بچایا۔

فإني عاشق غرر المعاني   ولي نفس. فداءك نفس حر

(لیکن) میں ایک بلند معانی عاشق ہوں اور مجھے ایک آزاد نفس عطا ہوا ہے

آمیر کے یہ تمام اشعار اُن کی مدحیہ شاعری کی مثال پیش کرتے ہیں۔ آمیر کو مدح، وصف، اور مرثیہ میں امتیاز حاصل تھا۔ اور چونکہ قصائد عموماً انھوں نے بالکل ابتدائی زمانہ میں کہے ہیں اس لئے عباسی دَور کا رنگِ شاعری ان میں زیادہ نمایاں ہے۔

ان کی شاعری میں اس رنگ کے لئے یہ شعر ملاحظہ ہو:-

وما کنت ممن یرهق العشق قلبه ولکن من یدری فتونك یعشق

میں اُن لوگوں میں نہیں ہوں جن کے قلب کو عشق برباد کردے لیکن جو تمہاری اداؤں سے آشنا ہے وہ عشق کرتا ہی ہے۔

آمیر نے جو مرثیہ کہے ہیں ان میں بھی وہی قدماء کا رنگ جھلکتا ہے، ابراہیم الیازجی کے مرثیہ کے دو شعر ملاحظہ ہوں:-

ایمك حقك لا ظلم ولا سرف لا ینکر الشمسَ الا فاقد البصر

آپ کا حق بغیر کسی زیادتی کے تسلیم ہے سورج کا انکار نابینا کے علاوہ کوئی نہیں کرسکتا۔

وقد یعاب الذی فی البدر من کلف ولیس یُسلَبُ معنی الحسن فی القمر

چاند کے گہن کو عیب لگایا جاتا ہے مگر اس سے چاند کے حُسن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس میں آمیر نے اپنی ان تنقیدوں کی جانب بھی اشارہ کیا ہے جو انھوں نے یازجی پر کی تھیں۔

آمیر شکیب شوقی کے مرثیہ میں فرماتے ہیں:-

یبکی الإسلام خیر جنوده أبداً ویرثی الشرق خیر حماته

اسلام اپنے بہترین سپاہی کو ہمیشہ روئے گا اور مشرق اپنے بہترین حامی کا مرثیہ خواں رہے گا۔

وکأن وادی النیل من أحزانه یلغی علی الشطّین من زفراته

گویا کہ وادیٔ نیل ان کے غموں (یعنی غمزدوں) میں سے ہے جو دونوں کناروں پر اپنی آہوں کو پھینک رہی ہے۔

میرا خیال ہے کہ ان کے تمام مرثیوں میں شوقی کے بارے میں یہ پورا مرثیہ بڑی فنکارانہ عظمت

کا حامل ہے۔

وصف میں بھی امیر کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ خاص طور سے دو نظمیں اس سلسلہ میں ان کے فن کی ترجمان کہلانے کی مستحق ہیں۔ "قریۂ حطین" کی تعریف جو فلسطین میں واقع ہے، اور دوسری "مسجدِ قرطبہ" مسجد قرطبہ میں امیر نے گذشتہ زمانے کی عظمت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ جیسے نگاہوں میں وہی زمانہ پلٹ آیا ہو لیکن اگر اس نظم کا موازنہ علامہ اقبال کی نظم "مسجد قرطبہ" سے کیا جائے تو امیر کی یہ نظم بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جائے گی، کیونکہ اس میں وہ ذہنی و فلسفیانہ بلندی نہیں ہے جو اقبال کی نظم میں موجود ہے۔ لیکن اس کے باوجود امیر کی نظم میں ایک حسرت انگیز منظر نگاری قابلِ تعریف ہے۔ اب چند اشعار اس نظم کے ملاحظہ ہوں:

تأمل یا خلیلی کم هنا من مهلل — إلی ربه صلی وکم من مکبر

اے میرے دوست ذرا سوچو کہ (اس مسجد میں) کتنے لوگوں نے نمازیں پڑھی ہیں

وکم ازهرت فیه أُلوف مصالح — وکم اوقدت ارطال عود وعنبر

اور کتنے نیک لوگ اس میں جلوہ افروز رہے اور کتنی خوشبوؤں سے یہ مسجد معطر رہی

خلیلی تأمل کالعرائس تنجلی — أساطین قد تحصی بألف وأکثر

میرے دوست غور کرو تو تمہیں ہزاروں ستون دلہن کی طرح مرصّع نظر آئیں گے۔

تراها صفوفاً قائمات کأنها — حدائق نصّت من جماد مشجر

تم ان کو قطار اندر قطار کھڑا ہوا پاؤگے گویا کہ وہ ایک ایسا باغیچہ ہے جہاں درخت جمادات سے تیار کئے گئے ہیں۔

وأشعر أُنی فی بلادی کأنما — تخاطبنی الأرواح من کل مقبر

اور میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اپنے ملک میں ہوں اور گویا یہاں روحیں ہر قبر سے مجھ سے باتیں کر رہی ہیں

وإنی أُری بالعین مالم أکن أُری — حقیقة فی وصف طرس ومزبر

اور میں آنکھوں سے وہ دیکھ رہا ہوں، جس کو میں دیکھنے والا نہ تھا۔

امیر نے شاعری کیوں ترک کردی؟ واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلہ میں کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی ہے جب اتنی چھوٹی عمر میں انھوں نے اتنی شہرت حاصل کرلی تھی تو وہ اگر مشق سخن کرتے رہتے تو یقیناً اپنے دور کے صف اول کے شعراء میں ہوتے۔ عام خیال یہی ہے کہ محمد عبدہ کی ملاقات اور قومی دلی درد نے ان کو نظم سے نثر کی جانب مائل کردیا اور وہ امیر الشعراء ہونے کے بجائے "امیر البیان" ہوگئے۔ وہ خود اپنے شعر کو ترک کرنے کا ذکر یوں کرتے ہیں :-

وکنت ملك الشعر حتی کرهته ... وأصبح عندی فی عداد المحارم

میں ملک الشعر تھا یہاں تک کہ میں نے شعر کو ناپسند کیا اور شعر کہنا میرے نزدیک گناہوں میں داخل ہوگیا۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ امیر کے اسلوب نثر پر ایک بحث کی جائے اور ان کے امیر اللسان، امیر البیان ہونے کے بعض گوشے سامنے کیے جائیں تاکہ ان کی عظمت کا یہ پہلو بھی نمایاں ہو جائے۔

امیر نے اگر شعر کا میدان چھوڑ دیا تو کیا ہوا انھوں نے نثر میں وہی شہرت حاصل کرلی۔ امیر کے اسلوب نثر کے بارے میں بڑے اختلافات ہیں۔ امیر قدیم اسلوب کسی حد تک پسند کرتے تھے، وہ خود کہتے تھے کہ میں قدیم ادب و اسلوب سے اپنا رشتہ منقطع کرنا پسند نہیں کرتا، اور فرماتے تھے کہ مترادفات بھی ایک مقام ہے۔ امیر اور خلیل اسکاکینی میں اسلوب کے بارے میں بڑے مباحثے ہوئے لیکن امیر نے ان کی رائے کو تسلیم نہیں کیا اور کہا کہ ادب کا ایک خاص اسلوب ہے علم و فن اسی اسلوب میں پیش کیے جاتے ہیں اور یہی عرب کا طریقہ ہے۔ بعد میں کچھ اس انداز کی بحث طٰہٰ حسین اور مصطفیٰ صادق الرافعی کے درمیان ہوئی[۱] رافعی امیر کے ساتھ تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ امیر کا اسلوب نہ بالکل قدیم ہے اور نہ بالکل جدید بلکہ دونوں اسلوبوں کی آمیزش سے ان کا اسلوب عبارت ہے۔ یہ بات قابل لحاظ ہے کہ امیر کے مقالات اور خطوط وغیرہ میں تجدد کی طرف زیادہ میلان ہے اور ان کی کتابوں میں جو اسلوب ہے اس کا جھکاؤ عصر عباسی کی جانب ہے جس میں

[۱] محاضرات۔ ص ۱۰۲، ۱۰۵، ۱۱۰

مترادفات، کہیں کہیں مقفّیٰ جملے اور طویل طرزِ تحریر ہے۔ اس میں تو شبہ نہیں کہ آمیر کا اسلوب جدید نہ تھا لیکن قدیم اسلوب کی صف میں بھی اس کو رکھنا ذرا مشکل ہے۔ ہاں اسے ایک پُر شوکت اسلوب سے ضرور تعبیر کیا جا سکتا ہے جو اس دَور میں اکثر ناقدین پسند نہیں کرتے۔

اس سلسلہ میں آمیر کی رائیں اور مناقشات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے اسلوب کی صحت اور صداقت نیز ادبیت پر کوئی شبہ نہیں تھا اور اس طرزِ اسلوب کو وہ نثر کا بہترین اسلوب تصور کرتے تھے اور اسی کو وہ عرب کا ادبی اسلوب تصور کرتے تھے۔[1]

آمیر کے اسلوب پر قدماء کی مہرِ صداقت ثبت ہے اور ان کے عمدہ رنگوں کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے اور اس پر لطفِ بیان و قدرتِ زبان ذرا دیکھئے کہ باوجود اس کثرتِ تصانیف آمیر کے یہاں اسلوب کی رکاکت، عدمِ یکسانیت اور اضمحلالِ تراکیب کا کہیں بھی وجود نہیں ہر جگہ قاری ایک متین و رصیف نیز مرصّع اسلوب پائے گا یہ بات پوری طرح اس امر کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ آمیر واقعی امیر بیان تھے۔

آمیر کے اسلوب میں حسنِ ترتیب اور بیان کی مجموعی کشش ہر جگہ کارفرما نظر آتی ہے۔

آمیر لمبے لمبے جملوں میں حسین وقفات کا ایک بڑا اچھا نثری طرزِ عبارت پیش کرتے ہیں گویا ایک لمبے جملہ کو کئی جگہ سے مناسب موقعوں پر کاٹ کر وہ اثر و کشش پیدا کر دیتے ہیں جو دراصل مختصر جملوں کا سارا سرمایہ ہوتا ہے، اس سلسلہ میں آمیر کو جو ایک قدرتی عطیہ حاصل ہے وہ ہے ان کے اندر ایک فطری سلیقہ حسین مترادفات کے اجتماع کا موجود ہے۔

صادق الرافعی کے یہاں کچھ اس طرز کا نثری اسلوب ملتا ہے مگر مجھے یہ کہنے میں ذرا بھی جھجک نہیں کہ وہ قوافی اور مترادفات میں ذرا زیادہ اُلجھ جاتے ہیں، جس کی وجہ سے پڑھنے والا قافیوں کے وجود کا بسا اوقات احساس کرنے لگتا ہے، مگر آمیر کے یہاں ایک ایسی روانی اور بے ساختگی نظر آتی ہے کہ قافیہ یا بندش کا احساس پیدا ہونے کے بجائے ایک فطری روانی میں لذتِ اسلوب سے قاری سرشار ہو جاتا ہے۔

---

[1] محاضرات از ص ۱۰۲ تا ۱۰۵

جہاں تک غریب الفاظ کے استعمال کا تعلق ہے وہاں صادق الرافعی، لطفی منفلوطی اور امیر تقریباً سب یکساں ہیں اور جس طرح طٰہٰ حسین کی کتابیں پڑھتے وقت یہ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ لغت اٹھائی جائے بلکہ قدماء ابن مقفع اور ابوالفرج الاصبہانی کی عبارتوں کی طرح ہر بات آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔

مذکورہ تینوں حضرات کے یہاں زیادہ نہیں کسی حد تک غریب اور مشکل الفاظ جابجا ضرور مل جاتے ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ اُنیسویں صدی کے نصف آخر اور بیسویں صدی کے نصف اوّل میں مصر و عرب میں اسلوب کے بارے میں اہلِ نظر ادباء دو بڑے مکتب خیال میں بٹے رہے، ایک جدید اسکول ہے جو ہر قسم کی قدامت سے مبرّا اور ایک بالکل سیدھے سادھے اسلوب پر زور دیتا ہے، دوسرا اسکول قدیم الخیال ہے اور بالکل تجدد اختیار کرنے کو قدماء سے اپنا رشتہ ختم کر لینے کے مترادف سمجھتا ہے۔ پہلے اسکول میں بیسویں صدی کے ممتاز لوگوں میں طٰہٰ حسین، احمد امین، عباس محمود عقاد اور خلیل جبران وغیرہ ہیں۔ دوسرے اسکول کے ممتاز صاحبِ طرز ادباء میں منفلوطی، صادق الرافعی، احمد حسن زیات اور خود امیر شکیب ہیں [1]

بہرحال کچھ بھی ہو امیر کے اسلوب میں پڑھنے والے کو زبان و بیان کا ایک جادو نظر آتا ہے اور ان کے تمام معاصرین کو امیر کی اس عظمت کا پورا احساس و اعتراف ہے سوا بعض غالی قسم کے لوگوں کے جیسے سکاکینی وغیرہ جو امیر کے اسلوب کو از کار رفتہ سمجھتے تھے [2]

---

[1] صادق الرافعی اور طٰہٰ حسین کے درمیان اس بحث کا مطالعہ " حدیث الابصاء " مصنفہ طٰہٰ حسین میں ملاحظہ ہو، الی الدکتور طٰہٰ حسین کے عنوان کے تحت رافعی کا خط اور اس کا جواب۔

[2] محاضرات ص ۱۰۵۔